

یومِ آزادی کا اعلان ہمارا دستور قرآن ہے!

۱۴ اگست کے موقع پر حکومت کی جانب سے نئے سیاسی ڈھانچے کا اعلان متوقع ہے۔ اور اخبارات میں اس سلسلہ کے طعن و تمین، قیاس آئیموں، سیاسی پیشگوئیوں اور تجاویز پر مشتمل خبریں اور بیانات شائع ہو رہے ہیں۔ چنانچہ امیر جماعت اسلامی کا خیال ہے کہ:

”ذات برادری کی بنیاد پر لوگ اگر منتخب ہو کر اسمبلیوں میں آئے تو انتخابات کا کچھ فائدہ نہ ہوگا“

اور اس طرح،

”حکومت نے نشانہ ہی کر دی ہے کہ وہ اقتدار نہیں چھوڑنا چاہتی۔“

— کالعدم جمعیت العلمائے اسلام درخواستی گروپ کے سیکرٹری جنرل نے غیر جماعتی بنیادوں پر انتخابات کی مخالفت کرتے ہوئے اس عدشہ کا اظہار کیا ہے کہ:

”نئے سیاسی ڈھانچے میں سیاسی جماعتوں پر پابندیاں عائد ہونے کا امکان ہے!“

— قومی کونسل برائے شہری آزادی کے سیکرٹری جنرل نے یہ اطمینان دلایا ہے کہ:

”انتخابات کے لیے عبوری حکومت کے قیام سے آئین کی خلاف ورزی نہیں ہوگی!“

— اور مجلس شوریٰ کی خصوصی کمیٹی نے پارلیمانی طرز حکومت کو ملک کے لیے موزوں قرار دیتے ہوئے

© rasailojaraid.com

”عام انتخابات بالغ ملتے دہی کی بنیاد پر کرنے کی سفارش کی ہے۔“
 — جبکہ کالعدم تحریک استقلال کے قائم مقام سربراہ نے یہ خوشخبری سنائی ہے کہ:
 ”کالعدم تحریک استقلال ایم۔آر۔ڈی کے اہل سول میں شرکت کرے گی۔“
 — پیشگوئی فرمائی ہے کہ:

”بلدیاتی انتخابات فراڈ ہیں!“

— اور مشورہ دیا ہے کہ:

”اسلامی مشاورتی کونسل تو مڑی جاتے!“ اور ”ملک میں فوراً جمہوری عمل
 بحال کیا جائے!“

(روزنامہ ”جنگ“ ۲۴ جولائی ۱۹۸۳ء)

یہ اس اسلامی مملکت کے سیاستدانوں کے بیانات ہیں، جس کی دیواریں ”لا الہ الا اللہ مُحَمَّدٌ رَّسُولُ اللّٰہِ“ کی بنیادوں پر اٹھائی گئی تھیں، جس کے قیام کے وقت ہر مسلمان مرد و عورت، بچے اور بوڑھے کی زبان پر یہی ایک نعرہ تھا۔ جس کے حصول کے لیے ہر قسم کی قربانیاں دی گئیں، آگ اور خون کے دویا عبور کیے گئے، ہزاروں لاشیں بڑھے۔
 جان دینی لٹا دی گئیں۔ اور یہ سب کچھ اس لیے کہ اس خطہ سرزمین میں بسنے والے
 اللہ رب العزت کی مشابہ کے مطابق اپنی زندگیاں بسر کر سکیں۔ اور یہ کہ اس
 مملکت خداداد کا دستور اللہ کا قرآن ہوگا، وہی قرآن مجید جس نے ایک اسلامی مملکت میں
 بسنے والوں کی یہ صفات گزائی ہیں،

”الَّذِينَ اِنْ مَّكَّنَّا لَهُمْ فِي الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلَاةَ وَآتَوُا

الزَّكَاةَ وَآمَرُوا بِالْمَعْرُوفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ“

کہ ”(اللہ کے بندے وہ ہیں) جن کو ہم الارض میں ملگے دیں تو وہ نمازیں

قائم کرتے، زکوٰۃ ادا کرتے، نیک کا حکم دیتے اور برائی سے منع کرتے ہیں!“

— جس نے یہ تنبیہ فرمائی تھی کہ:

”مُنِيبِينَ اِلَيْهِ وَاتَّقُوهُ وَاَقِمُوا الصَّلَاةَ وَلَا تَكُونُوا مِنْ

الْمُشْرِكِينَ ۚ مِنَ الدِّينِ مَنَعُوا حَتَّىٰ دُفِنُوا وَكَانُوا شُرَٰعًا

كُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُونَ !

”اللہ کی طرف رجوع کرنے والے (ہو کر) ہیں اسی سے ڈرتے رہو، نمازیں قائم کرو اور مشرکین میں سے نہ ہو جاؤ کہ جنہوں نے اپنے دین میں تفرقہ ڈالا اور ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے (اور اب حالت یہ ہے) ہر گروہ، جو کچھ اس کے پاس ہے، اسی پر نازاں ہے!“

چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ پاکستان کے حصول کے لیے ایک پلیٹ فارم پر جمع ہونے والے اب متعدد گروہوں میں بٹ کر رہ گئے ہیں اور بھانت بھانت کی برلیاں بول رہے ہیں۔ اگرچہ نعرہ سب کا ایک ہی ہے، لیکن یہ اس نعرہ سے مختلف ہے جو قیام پاکستان کے وقت لگایا گیا تھا۔ جی ہاں، یہ آج سے پچیس برس پہلے کی بات ہے جب فضائیں ”پاکستان کا مطلب کیا؟“
لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ

سے گونج رہی تھیں، اب تو ہر طرف سے ایک ہی آواز سنائی دیتی ہے۔ سادہ کے اندھے کو ہر ای ہر اسوجھ رہا ہے:

”انتخاب، انتخاب، انتخاب۔ ا۔“

— گویا ان کے نزدیک یہی حاصل زندگی ہے، مرتے وقت یہی کلمہ ان کے زبانوں پر جاری ہونا چاہیے۔ قبر میں منکر نکیر یہی سوال ان سے کریں گے، حشر کی جہاں ہو اور نازک ٹھٹھریوں میں یہی نعرہ ان کی مشکلات کو آسان بنائے گا، میزبانِ محل میں اسی پرچی کا وزن گناہوں کے پلڑے پر جاری ہو گا جس پر انتخاب کا نعرہ درج ہو گا۔ اللہ رب العزت، انتخابات کی آن پر مرنے یا اس سے روگردانی کا ہی سب سے پہلا سوال ان سے کریں گے۔ یعنی۔

روزِ محشر کہ جہاں گدازہ بود

اولیں پریش ”انتخاب“ بود

غرض نامہ اعمال اسی کو داہنے ہاتھ میں ملے گا، پھر وہ بلا امت و بی عبور کر سکیں گے اور جنت میں داخلہ کامل صرف انہیں ملے گا جنہوں نے جماعتی ذبیہ دوں پر انتخابات کروائے تھے۔

۱۴ اگست کو تحریک چلنی تھی۔ اور انہی سر توڑ کوششوں میں انہوں نے اپنی جانیں
جاں آفرین کے سپرد کر دی تھیں۔
یہ رتبہ بلند ملا جس کو مل گیا، ہر مدعی کے واسطے دار و رسن کمان
— اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ !

موجودہ دور کی اسلامی تحریکوں کا اگر جائزہ لیا جائے تو ان کی ابتداء میں یہی نعرہ
سر پرست دکھائی دیتا ہے کہ:

”قرآن ہمارا دستور ہے!“

لیکن جو اچل وقت گزرتا جاتا ہے اور یہ تحریکیں اقتدار سے ہم آغوش ہونے لگتی
ہیں، اسی قدر اس نعرہ کو بلند کرنے والوں کے گلے بندھنے چلے جاتے ہیں۔ چنانچہ
کامیابی کے بعد عملی زندگی میں اس سے اس طرح بے اعتنائی برتی جاتی ہے کہ ایک وقت
آتا ہے جب علمی سطح پر بے شمار شبہات و محاذات نظریات سے اس کی تردید و تاویل کا
سلسلہ شروع ہو جاتا ہے:

پاکستان کی چھتیس سالہ تاریخ بھی اسی طرز عمل سے عبارت ہے۔ تشکیل پاکستان
کے بعد اس نعرہ کو کیسے فراموش کر کے تقریباً مردود میں جمہوریت کے راگ الاپے گئے اور
یا پھر جمہوریت کو مشرف بہ اسلام کرنے کی سر توڑ کوششیں ہوتی رہیں، نتیجہ یہ ہوا کہ خدا تو
ویسے ہی نہ ملتا تھا کہ اس سے بغاوت کی ٹھان لگتی تھی، وصال صغیم بھی نصیب نہ ہو سکا۔
جمہوریوں کو اس ملک میں مارشل لا، اسلامی سوشلزم، آمریت وغیرہ سب کچھ تو ملے،
لیکن جمہوریت نہ مل سکی۔ طرفہ تماشا یہ کہ جمہوریت کا نعرہ بلند کرنے والی سیاسی
جماعتوں کو، اپنی جماعتی سیاسی زندگی میں بھی اس کا تصور ڈھونڈنے سے نہیں ملتا چنانچہ جمہوریت
کا لازمہ انتشار و افتراق و تشتت، ان کا مقدر بن کر رہ گیا ہے۔ تاہم اعلانات و بیانات
کی حد تک یہ نعرہ استعمال ضرور ہوتا رہا ہے (اور اب بھی ہو رہا ہے)۔ ملک کا
مشرقی بازو کٹ گیا، لیکن بیہوشیوں کو ہوش نہ آیا۔ حتیٰ کہ تحریک نظام مصطفیٰ چلی
لیکن جب یہ تحریک کامیابی کی پہلی منزل سے ممکنہ ہوئی تو ”قرآن ہمارا دستور ہے“ کسی کو
یاد بھی نہ رہا۔ چنانچہ ہمیں یہ فہم چاہیے کہ نفاذ کا آواز بلند ہوا، تو کسی

کونے سے دوبارہ جمہوریت کی بدھرتانوں نے فضاؤں میں ارتعاش پیدا کرنا شروع کیا۔ اسی دوران حکومت کے ایوانوں سے یہ اعلان بھی سنائی دیا:

”اسلام کا نعرہ ہر دور میں بلند کیا جاتا رہا ہے لیکن عملاً ایسا نہ ہو سکا، اب وہ وقت آ گیا ہے کہ اس ملک میں کتاب و سنت کی حکمرانی ہوگی!“

تاہم سیاستدان اپنی بساط سیاست پر جمہوریت کے ٹہرے سجا کر پھر سے اپنے چلنے پھیل میں مشغول ہو چکے تھے۔ ان حالات میں شریعت کی عملداری میں عملی تعاون تو کیا موتا۔ حکومت اور سیاستدان ایک دوسرے سے لٹ کر رہ گئے۔ اور اب وہ مرحلہ درپیش ہے کہ حکومت یوم آزادی کے موقع پر کسی نئے سیاسی ڈھانچے کا اعلان کرنے والی ہے اور سیاستدان مضطرب ہیں کہ اس نئے سیاسی ڈھانچے میں ان کے لیے اپنی لیلائے اقتدار کے رُخِ نیبا کا ایک پر تو جمال دیکھ لینے کے مواقع کس حد تک موجود ہیں!

حکومت اور سیاستدانوں کے ایک دوسرے سے کٹ کر رہ جانے کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ حصول اقتدار اور طوالت اقتدار کی دوڑ شروع ہو چکی ہے۔ اس دوران معاشرتی برائی، اخلاقی پے راہروی، فحاشی، لہو و لعب اور شرک و بدعات کو جس قدر فروغ حاصل ہوا ہے، اسے اگر سیاستدانوں اور حکومت کی ناگزیر ضرورت کہہ دیا جاتے تو بے جا نہ ہو گا۔ تاکہ عوام کو ان لھلوں سے بہلایا جاسکے، سیاستدان الٹ بیانیعت داغنے رہیں اور حکومت اہمیان سے اپنی دانست میں اسلام نافذ کرتی رہے۔ تاہم یہ صورت حال جلد ختم ہو سکتی تھی اگر ملک میں کتاب و سنت کی حکمرانی کے وعدہ کا صحیح معنوں میں پاس کیا جاتا۔ چنانچہ لاہور ہائیکورٹ میں ملک کی ایک بڑی شخصیت جسے موجودہ قانون کو مسلمان بنانے کی ذمہ داری سونپی گئی ہے، کے ایک عالیہ خطاب نے ان خوش فیہوں کو بھی رفع کر دیا ہے۔ یہ خطاب سعودی ناظم الامور کے ایک خطاب، جس میں قرآن کو مسلمان حکومتوں کا دستور قرار دیا گیا تھا، کے بعد کیا گیا۔ اس خطاب کا خلاصہ یہ ہے کہ:

”قرآن مجید اسلامی اصول و اخلاق، فلسفہ اور وعظ کی کتاب ہے، جبکہ ہمیں

حدود و تعزیرات اور دیگر باندیوں کی بھی ضرورت ہے۔ لہذا معاشرے

لے واضح رہے کہ خلفائے راشدین رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین اور بعد کے ادوار میں اسلامی حکومتوں کا دستور و قانون

۲- میں متعین اقدامات کے لیے ہمیں دستور و قانون خود وضع کرنا ہوگا۔
کتاب و سنت کی تعبیر و تشریح میں فقہاء کا اختلاف ہے ہم تقلید کی بجائے اس رائے کو قانونی طور پر اختیار کریں گے جو ہماری عقل اور معاشرتی حالات سے مناسب ہوگی کیونکہ امام ابوحنیفہؒ کے فرمایا ہے،
”محشی شخص کو میری رائے سے دلیل اس وقت اپنانی چاہیے، جب اس کی تصدیق اس کی عقل کرتی ہو۔“

۳- مروجہ قانون و عرف کو اسلام میں بڑی اہمیت حاصل ہے کیونکہ اسلام انسانی فطرت سے مطابقت کا حامی ہے۔ اسلامی حکومت کا کام صرف یہی ہے کہ مروجہ قانون و عرف میں جو چیز شریعت کے منافی ہو اسے تبدیل کر دے۔ چنانچہ امام شافعیؒ نے اپنی کتاب ”الرسالہ“ میں مروجہ قانون و عرف کے شریعت سے مطابقت اور مخالفت جانچنے کے اصول پیش کیے ہیں۔
تاہم یہ کام بھی علما سے زیادہ بہتر و کلا اور جدید قانون دان طبقہ کر سکتا ہے، کیونکہ علما کو مروجہ قانون و عرف سے واقفیت نہیں۔“

مذکورہ بالا خطاب کے ان حوالوں سے یہ اندازہ آسانی ہو سکتا ہے کہ ”قرآن ہمارا دستور ہے“ کے لغوی معنی صرف یکسر نظر انداز کر دیا گیا ہے، بلکہ اس سلسلہ میں وہ اسوسنک صورت حال بھی ہمارے سامنے ہے جس کا ذکر ہم نے اوپر کیا ہے۔ یعنی علمی سطح پر بے شمار شبہات اور ملحدانہ نظریات سے اس لغوی معنی کی تردید کی جا رہی ہے اور واضح لفظوں میں یہ کہہ جا رہا ہے کہ،

”قرآن مجید کو بطور دستور نہیں اپنایا جاسکتا کیونکہ

قرآن مجید اسلامی اصول و اخلاق، فلسفہ اور وعظ کی کتاب ہے، معاشرے میں

متعین اقدامات کے لیے جدید انداز میں ہمیں دستور و قانون خود وضع کرنا ہوگا۔“

قرآن مجید ہی تھا اور وہ اس کی آخری تعبیر سنت رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی پابندی کرتے ہوئے جملہ حدود و تعزیرات اور دیگر قانونی اقدامات اسی سے کرتے رہے۔ محشی دیگر قانون سازی کی ضرورت کبھی محشی نے محسوس نہیں کی۔

حالانکہ یہ نظریہ قرآن مجید سے انتہائی بے خبری کی دلیل ہے۔ قرآن مجید کو نہ صرف دستوری حیثیت حاصل ہے، بلکہ اسی قرآن مجید میں اللہ رب العزت نے یہ تنبیہ بھی فرمائی ہے:

”وَمَنْ لَمْ يَحْكَمْ بِمَا أَنْزَلَ اللَّهُ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْكَافِرُونَ“
 ”وَمَنْ لَمْ يَحْكَمْ بِمَا أَنْزَلَ اللَّهُ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الظَّالِمُونَ“
 ”وَمَنْ لَمْ يَحْكَمْ بِمَا أَنْزَلَ اللَّهُ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْفَاسِقُونَ“ له
 (المائدة: ٣٣، ٣٤، ٣٥)

کہ ”جو کوئی اس چیز کے مطابق فیصلہ نہ کرے جو اللہ تعالیٰ نے نازل فرمائی ہے تو یہی رنگ کاغذ ہیں۔ یہی لوگ ظالم ہیں۔ اور یہی لوگ فاسق

“ہی!”

قرآن مجید کا یہ مقام ملاحظہ ہو، جہاں یہ آیات مذکور ہیں، ان کے سیاق و سباق میں نہ صرف قانوں قصاص کا ذکر ہے بلکہ مذکورہ تین آیات کے علاوہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو مخاطب فرماتے ہوئے ”فَاَحْكُمْ بِمَا اَنْزَلَ اللّٰهُ“ اور ”اِنْ اَحْكُمُ بَيْنَكُمْ فَمَا اَنْزَلَ اللّٰهُ“ کے الفاظ بھی وارد ہیں۔

بتلتے، یہ آیات کو میہ قرآن مجید کو محض فلسفہ و وعظ کی ایک کتاب قرار دے رہی ہیں اس کی دستوری حیثیت کا اعلان کر رہی ہیں؟ — یہی نہیں بلکہ ان آیات سے، ”ہمیں دستور قانون خود وضع کرنا ہو گا“ کا مسئلہ بھی مل جاتا ہے کہ کتاب و سنت کے تحت نئے دستور سازی کی کوئی بھی کوشش قرآن مجید کی نظر میں گھبراہٹ اور فسق کے زمرہ میں آئے گی۔

ستم ظریفی کی انتہا تو دیکھیے، ایک طرف قرآن مجید سے یہ نادانیت ہے اور دوسری طرف دعویٰ اتنا بڑا کہ :

”ہم تقلید کی بجائے اس رائے کو قانونی طور پر اختیار کریں گے جو ہماری

عقل اور معاشرتی حالات سے مناسب ہوگی!“

تقلید کو تو خیر، ہم بھی جزو ایمان نہیں سمجھتے، لیکن اس "ہماری عقل" کا اندازہ لگائیے، جس کو قانونی طور پر اختیار کیا گیا ہے۔

دے دیا گیا ہے اور دوسری طرف یہ عقل امام ابو حنیفہؒ کے ایک قول کا مفہوم سمجھنے سے بھی قاصر ہے۔ ارشاد ہوتا ہے، امام ابو حنیفہؒ نے فرمایا ہے:

”کسی شخص کو میری رائے مع دلیل اس وقت اپنانی چاہیے، جب اس کی تصدیق اس کی عقل کرتی ہو!“

حالانکہ آپؒ نے جو بات بیان فرمائی ہے، وہ یہ ہے کہ، ”کسی شخص کو میری رائے کے مطابق فتویٰ دینا اسی وقت درست ہے، جب وہ میری دلیل سے واقف ہو!“

— یہی حال امام شافعیؒ کی کتاب ”الرسالہ“ کے موضوع کو سمجھنے کا ہے۔ امام شافعیؒ نے اس کتاب میں مروجہ قانون و عرف کی شریعت سے مطابقت اور مخالفت جانچنے کے اصول پیش نہیں کیے، کیونکہ اس وقت نہ کوئی وضعی قانون موجود تھا اور نہ ہی یہ مسئلہ زیر بحث تھا۔ بلکہ انہوں نے کتاب و سنت کا باہمی ربط و مطابقت اور ان دونوں کے فہم و تفہیم کے اصول اس میں بیان فرمائے ہیں! لیکن اس کے باوجود دعویٰ یہ ہے کہ:

”مروجہ قانون و عرف میں جو چیز شریعت کے منافی ہو اسے تبدیل کرنے کا کام علماء سے زیادہ بہتر و کلام اور جدید قانون دان طبقہ کر سکتا ہے کیونکہ علماء کو مروجہ قانون سے واقفیت نہیں!“

— جبکہ وکلاء اور جدید قانون دان طبقہ کا حال یہ ہے کہ نہ قرآن مجید سے واقفیت ہے، نہ سنت کے معیار اور مفہوم سے شناسائی ہے، نہ ائمہ کے اقوال و فرائض کا مفہوم و محل وہ متعین کر سکتے ہیں۔

— جہاں تک کتاب و سنت کی تعبیر و تشریح میں فقہاء کے اختلاف کا تعلق ہے تو یہ دستوری اختلاف نہیں۔ اس لیے کہ فقہاء کی آراء کتاب و سنت کے فہم میں مفید ضرور ہیں، لیکن کتاب و سنت ان کی پابند نہیں کیونکہ فقہاء کے اجتہادات مختلف ہونے کی بنا پر فقہ کا متعدد ہونا سب کے نزدیک مسلم ہے لیکن شریعت جسے اسلامی مملکت کا دستور کہا جاسکتا ہے، صرف ایک ہے اور وہ کتاب و سنت ہے۔ اگرچہ قرآن کریم کی بعض قراءتوں کا اختلاف ہے لیکن اس کا تعلق تفصیلات کا بھی اختلاف

ہے۔ لیکن یہ اختلاف اتنا نادر ہے جس کا کتاب و سنت کی دستوری حیثیت پر کوئی اثر نہیں پڑتا جبکہ کتاب و سنت کے بعد مجتہدین کی آراء کو بھی اگر دستوری حیثیت دے دی جائے تو وہی مشکل پیش آئے گی جو آج دستور و قانون کے وضع کرتے وقت مسلمان حکومتوں کو درپیش ہے، حالانکہ بنیادی غلطی یہ ہے کہ وہ نام شریعت کا لیتے ہیں لیکن نافذ کرنے کے لیے اپنے سامنے ائمہ کی فقہ یا جدید آراء کو رکھ لیتے ہیں۔ گویا انسانی کوششوں کو شریعت کا مقام دینے کے لیے یہ تگ و دو ہوتی ہے جس کا نتیجہ اختلافات اور انتشار کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے اور مخالفین کو یہ طعن دینے کا موقع ملتا ہے کہ کسی حکومت کے لیے دین و مذہب کو دستوری حیثیت دینے کا تصور غلط ہے۔

فغنی مسائل میں اختلاف کے باوجود کتاب و سنت کی دستوری حیثیت متاثر نہ ہونے کے سلسلہ میں بطور مثال حضرت عمرؓ کے دور کے اس واقعہ کا تذکرہ مناسب ہوگا جب آپؐ نے حق مہر کو محدود کرنے کا ارادہ فرمایا تو ایک بڑھیا نے اٹھ کر آپؐ کو ٹوک دیا: ”امیر المؤمنین! التدریب العزت نے قرآن مجید میں ”وَاتَّبِعُوا احْدَاہُنَّ قَسْطًا“ کے الفاظ ذکر فرمائے ہیں، پس جب قرآن مجید نے حق مہر کو محدود نہیں فرمایا تو آپ اس کی تحدید فرمانے والے کون ہوتے ہیں؟“ چنانچہ حضرت عمرؓ نے اس بڑھیا کی دلیل کو قبول کرتے ہوئے اپنے فیصلے سے رجوع فرمایا۔

— اسی طرح مجتہدین کی آراء کو دستوری حیثیت نہ دے سکنے کے سلسلہ میں امام مالکؒ کے اس رویہ کا حوالہ دیا جاسکتا ہے، جو پہلے منصور اور پھر ہارون رشید کی اس پیشکش کے جواب میں تھا کہ فقہاء کے اختلاف کے پیش نظر مناسب ہوگا کہ انکی کتاب مؤطا کو دستوری حیثیت دے دی جائے لیکن امام مالکؒ نے دونوں حیثیتوں سے اپنی اس تالیف کو دستور بنانے سے اتفاق نہ کیا۔ ایک دفعہ یہ جواب دیا کہ میری کتاب جملہ سنن و احادیث کا احاطہ نہیں کرتی اور دوسری دفعہ یہ جواب دیا کہ فقہاء مختلف شہروں میں پھیلے ہوئے ہیں، ان کو کسی رائے کا پابند نہیں کیا جاسکتا۔ یعنی مؤطا میں فقہاء کے جو فتاویٰ مذکور ہیں، ان کی پابندی

سب پر لازمی نہیں ہے

۱۔ مندرجہ بالا سطور میں حضرت عمرؓ اور امام مالکؒ کا جو واقعہ بیان ہوا ہے ہم نے اپنے الفاظ میں اس کا مفہوم بیان کیا ہے، اصل الفاظ یوں ہیں :

(ا) قَالَ عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ لَا تَغْلُوا فِي مَهْوَرِ النَّسَاءِ فَقَالَ امْرَأَةٌ «لَيْسَ ذَٰلِكَ يَا عُمَرُ إِنَّ اللَّهَ يَقُولُ (وَأَتَيْنَهُمْ إِحْدَاهُنَّ فَنَظَارًا) مِنْ ذَٰهَبٍ»..... فَقَالَ عُمَرُ: إِنَّ امْرَأَةً خَاصَمَتْ عُمَرَ وَخَصَمَتْهُ (تفسیر ابن کثیر ج ۱ ص ۴۶۷)

”حضرت عمرؓ نے فرمایا، ”عورتوں کے حق میں ہر باندھنے میں غلو سے کام نہ لو، تو ایک عورت نے کہا، ”عمرؓ، آپ کو یہ کہنے کا کوئی حق نہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں حق میں ہر کے بیان میں فرمایا ہے :

”اگر تم عورتوں کو ڈھیروں مال دے چکے ہو“ سونے سے..... پس حضرت عمرؓ نے فرمایا، ”ایک عورت نے عمرؓ سے جھگڑا کیا اور وہ اس پر غاب“

(ب) طبقات ابن سعد میں امام مالکؒ کے الفاظ یوں مذکور ہیں :

”فَقُلْتُ يَا أَمِيرَ الْمُؤْمِنِينَ لَا تَفْعَلْ هَذَا، فَإِنَّ النَّاسَ قَدْ سَبَقَتْ إِلَيْهِمْ أَقْوَابُ دُرٍّ وَسَمِعُوا أَحَادِيثَ وَرَوَّاءَ رَوَايَاتٍ وَآخَذَ كُلُّ قَوْمٍ بِمَا سَبَقَ إِلَيْهِمْ وَذَانُوا بِهِ فَلَجَّ النَّاسُ وَ مَا اخْتَارَ أَهْلُ كُلِّ بَلَدٍ مِنْهُمْ إِلَّا نَفْسَهُمْ“

”پس میں نے (امام مالکؒ) نے خلیفہ منصورؒ سے کہا، ”یا امیر المؤمنین (میر) تابعیت تو ملو کہ دستورِ حیثیت دینے کا یہ کام نہ کیجئے، کیونکہ لوگوں کے پاس اقوال پہنچ چکے، احادیث انہوں نے سن لیں، روایات انہوں نے روایت کیں اور ہر قوم نے اس چیز کو لے لیا جو اس کے پاس پہنچ چکی اور اسی کی انہوں نے پیروی کی، پس ہر شہر کے لوگوں نے اپنے لیے جس چیز کو اختیار کر لیا، اس پر انہیں چھوڑ دیجئے۔“

اسی طرح امام مالکؒ کا قول ہے

مختصر اس خطاب کے مذکورہ نکات پر تبصرہ یوں کیا جاسکتا ہے کہ:

”لا الہ الا اللہ“ کا معنی یہ ہے کہ عبادت و اطاعت صرف اللہ کی ہے، جبکہ سیاستدانوں نے عبادت کو تو عوام کا بچی معاملہ قرار دیا (جیسا کہ حال ہی میں اس سلسلہ کے دو اخباری بیانات سامنے آتے ہیں کہ نماز روزہ عوام کا ذاتی مسئلہ ہے) اور دوسرے بیان میں ایک خاتون لیڈر نے یہ کہا ہے کہ ”امیدواروں کے لیے صوم و صلوٰۃ کی پابندی بے معنی ہے، ان کا مسلمان ہونا کافی ہے۔“ یعنی ان کے نزدیک مسلمان صوم و صلوٰۃ کے بغیر الگ (کوئی چیز ہے) اور اطاعت کا حق اپنے لیے مخصوص کر لیا۔ وہ یوں کہ دستوری حیثیت میں اس چیز کو حاصل ہے جسے اسمبلی پاس کرے۔

پھر اگر معاملہ یہیں تک محدود رہتا کہ اسمبلی کا اصل مشن شریعت کی صریح تعبیر اور موجودہ حالات پر اس کی تطبیق ہے تو بات کسی حد تک قابل فہم تھی، لیکن سیاستدانوں نے اپنے اس حق پر اجارہ داری قائم رکھنے کے لیے کتاب و سنت کا علم رکھنے والے کو تعبیر شریعت کے حق سے یوں محروم کر دیا کہ اسے جدید تقاضوں اور جدید معاشرہ کے مسائل سے واقفیت نہیں — اور چونکہ دستور سازی میں اصل اہمیت عصری حالات اور عرف کو ہے، اس لیے کتاب و سنت کا عمل رکھنے والا کسی اجتہاد کا اہل نہیں — گویا اولاً تو قرآن مجید کو دستور بنانا غلط ہے اور دوسرے اس کی تعبیر وہ لوگ نہیں کر سکتے جنہوں نے فہم قرآن اور اس کے متعلقہ علوم پر زندگیاں صرف کی ہیں۔ تیسرے دستور میں اصل اہمیت فہم قرآن کو نہیں، جدید معاشرے کو ہے — وہی جدید معاشرہ جس میں پروان چڑھنے والے ایک بہترین دماغ کا نمونہ آپ مندرجہ بالا سطور میں ملاحظہ فرما چکے ہیں!

کتاب و سنت پر ان صریح زیادتوں کا صدمہ ابھی تازہ تھا کہ، ۱۷ جولائی ۸۳ء کی

(بقیہ حاشیہ)

”مَا مِنْ أَحَدٍ إِلَّا وَقَوْلُهُ مَقْبُولٌ وَمُرُودُهُ عَلَيْهِ الْأَصَابِ هَذَا الْقَبُولُ“
 ”ہر کسی کی بات قبول کی جاسکتی ہے اور چھوڑی بھی جاسکتی ہے، سوائے اس (روحانی)
 اقدس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے (صاحب قرآن) ”معلی اللہ مدید وسلم!“

اشاعت میں ”مسکن و افکار“ کے عنوان کے تحت نامور صحافی زیڈ۔ اے سلہری صاحب کا مضمون مزید اضطراب کا باعث بنا۔ جس کا خلاصہ یہ ہے کہ :

- ۱۔ ”اسلامی دستور و نظام، ملکی آبادی کی اکثریت کے فیصلے سے نافذ ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پاکستان کو ہندوستان سے الگ کیا گیا تاکہ مسلمان اکثریت اپنی مرضی کا قانون نافذ کر سکے۔“
 - ۲۔ ”خالصتاً اسلامی نظام پر اصرار اس لیے بے معنی ہے کہ اسلام نے ہمیں زندگی کے بنیادی تصورات دیے ہیں، کسی خاص نظام کا ڈھانچہ نہیں دیا۔“
 - ۳۔ ”دنیا میں مروجہ نظاموں اور تہذیبوں سے کٹ کر اپنی ڈیڑھ ارب کی مسجد الگ نہیں بنائی جاسکتی۔ دریا کی لہروں کے خلاف پیرنے کی بجائے اس کی موافقت میں پیرنا ہی منزل مقصود پر پہنچنے کی ضمانت ہوتا ہے۔“
- حالات کا جائزہ :

۱۔ اسلامی نقطہ نگاہ سے شریعت سازی اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوتی ہے اور اس کا نفاذ نبی کریم ﷺ سے ہوتا ہے جس میں کسی تنسیخ و ترمیم کی گنجائش نہیں ہوتی۔ اور شریعت چونکہ جامع اور کامل ہے، لہذا اس کے ساتھ کسی مروج قانون کی پیوند کاری بھی نہیں ہو سکتی، کجایہ کہ کوئی نیا دستور، نئی شریعت ایجاد کر لی جائے۔

— ویسے بھی یہ حضرت بھول رہے ہیں۔ اسلامی دستور و نظام ملکی آبادی کی اکثریت کے فیصلے سے ”چھتیس سال کا طویل عرصہ گزر گیا، آج تک تو نافذ نہ ہو سکا۔“ ہاں پاکستان ضرور بن گیا تھا۔ تاہم یہ بھی ملکی آبادی کی اکثریت کے فیصلے سے نہیں بنا تھا۔ ملک ہندوستان میں مسلمان اقلیت میں تھے، اکثریت ہندو کی تھی، اس کے باوجود اگر پاکستان بن گیا تو آپ کا بیان کردہ اصول الٹ ہوتا نظر آتا ہے۔ لہذا آپ کو یوں کہنا چاہیے کہ :

”پاکستان کو ہندوستان سے اقلیت کی بنا پر الگ کیا گیا تاکہ مسلمان اقلیت اپنی مرضی کا قانون نافذ کر سکے۔“

۲۔ ہمیں یقین نہیں آتا کہ یہ بات (خالصتاً) اسلامی نظام پر اصرار اس لیے بے معنی ہے کہ اسلام نے ہمیں زندگی کے بنیادی تصورات دیے ہیں، کسی خاص نظام کا ڈھانچہ

نہیں دیا، ایک مسلمان کہہ سکتا ہے یا تم از کم تابع اسلام سے اس قدم ناواقف شخص صحابیوں کے زمرہ میں جو نکر شمار ہونے لگا۔ ”دواور دوچار روٹی“ کے مصداق دراصل یہ حضرت اسلامی نظام کا ڈھانچہ خلفاء اربعہ کے طریق انتخاب کو قرار دے رہے ہیں۔ یہ بات حادث نے انہیں اس وہم میں مبتلا کر دیا ہے کہ اسلام نے ہمیں کسی خاص نظام کا ڈھانچہ نہیں دیا۔

حالانکہ ہمیں سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ اسلام نے طریق و طرز انتخاب کو اصل مقصود نہیں قرار دیا بلکہ مقصود و مطلوب شریعت کے نفاذ کا اعلان و تعمیل ہے۔ جو بھی حکومت یہ کام کر دکھائے گی، اسلام کی نظر میں وہی اسلامی حکومت کہلائے گی۔ تو پھر آپ کو مارشل لاہ سے اس قدر نفرت اور جمہوریت سے اس قدر پیار کیوں ہے؟ اگر مارشل لاہ ملک کے لیے نیک فال نہیں تو جمہوریت نے ہمیں آج تک کیا دیا ہے؟ یہی ناکہ ملک دو لخت ہو گیا؟۔ بہر حال یہ الگ بحث ہے! ہم کہنا یہ چاہتے ہیں کہ اگر موجودہ حکومت اسلام کے نفاذ یا قرآن مجید کی دستور کی حیثیت کا اعلان کر دے پھر صحیح معنوں میں اس کی تعمیل بھی ہو، تو کیا یہ حکومت غیر اسلامی ہوگی؟ اور گذشتہ حکومتوں میں سے اگر کسی حکومت نے انتخابات تو جمہوری بنیادوں پر کرائے تھے، لیکن شریعت کی عملداری کی توفیق اسے نہ ہو سکی تو کیا یہ اسلامی حکومت تھی؟۔ علاوہ ازیں خلفائے اربعہ کے طریق انتخاب میں تفاوت کی بنا پر کیا آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ ان حضرات کا یہ دور خلافت خالصتاً اسلامی نظام نہیں تھا؟۔ اور اگر یہ خالصتاً اسلامی نظام تھا تو پھر اس پر اصرار کیوں نہیں کیا جاسکتا؟

واضح رہے کہ ہمہرا مقصود عصر رسالت اور دور خلافت راشدہ کو بطور مثالی اسلامی نظام پیش کرنا ہے۔ کیونکہ یہ حضرت ان مقدس ادوار کو اسلامی نظام یا اس کا ڈھانچہ تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں۔ حالانکہ اگر کوئی نظریہ کسی نظام کی صورت میں متشکل نہ ہو تو وہ نظریہ ہی بیکار ہوتا ہے۔ اگر اسلامی نظریے کا کوئی متعین اور مثالی اسلامی نظام نہیں تو یہ اسلامی نظریہ ہی کا انکار ہے۔

در اصل طریق انتخابات وغیرہ کے جس اختلاف سے بھرنا کہ یہ حضرت ان ادوار کو اسلامی نظام قرار دینے سے انکار کرنے سے اس کی دین سے ناکہ نفی کا منہ بولنا

ثبوت ہے۔۔۔۔۔ ہر نظام کو چلاتے ہوئے تدبیری امور سے بھی واسطہ پڑتا ہے اور تدبیر کے سلسلے میں شریعت ہم پر کوئی قدرغن عائد نہیں کرتی۔ بشرطیکہ ایسی کوئی تدبیر غیر اسلامی اصولوں پر مبنی نہ ہو۔ اس لیے تقرر و انتخاب کے مسئلہ میں، ان ادوار میں جو مختلف طریقے سامنے آتے ہیں، اس حد تک یہ معاملہ تدبیری تھا۔ تاہم یہ اسلامی نظام ہی کا حصہ تھا اس لیے یہ نہیں کہا جاسکتا کہ اسلام کا کوئی مثالی نظام ہی نہیں جس کی پابندی امت پر لازمی قرار دی گئی ہو۔

ہاں اگر ارشاداتِ عالیہ کا مفہوم ہم نے غلط سمجھا ہے تو آپ ہی وضاحت فرمادیجئے کہ ”زندگی کے بنیادی تصورات“ اور ”کسی خاص نظام کے ڈھانچے“ سے آپ کی کیا مراد ہے جہاں تک ہمارا تعلق ہے، رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا مبارک دورِ حیات خلفائے راشدین کا زریں دور اور اس کے بعد بھی کئی حکومتمیں ہماری نظر میں خالصتاً اسلامی نظام کی حامل تھیں، لیکن اگر آپ کو اس سے انکار ہے تو شاید پوری تاریخ اسلام میں کوئی ایک حکومت بھی اسلامی نظام کی حامل نہیں گزری۔۔۔۔۔ تو پھر آپ نے پاکستان کو ہندوستان سے الگ کرنے کی یہ کیا مصیبت مول لے لی تھی؟ ”قرآن ہمارا دستور ہے!“۔ اس کا کیا مطلب تھا؟۔ تحریک نظامِ مصطفیٰ کیوں چلائی گئی تھی؟ بھڑوی کیا بُرا تھا؟ آخر ملکی آبادی کی اکثریت ہی نے تو اسے پاکستان کا ذریعہِ اعظم بنایا تھا؟۔ اسلامی نظریات و اصول کے حامل تو آپ اکھنڈ بھارت میں رہ کر بھی بن سکتے تھے؛

۳۔ دنیا میں مروجہ نظاموں اور تہذیبوں سے کٹ جانا اگر آپ کے نزدیک ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ بنانے کے مترادف ہے تو ہندوستان کی سرزمینِ آپ کو کیوں اس نہ آئی؟۔ کیا اتنی قربانیاں دینے کے بعد اب آپ کو احساس ہوا ہے کہ پاکستان نہیں بننا چاہیے تھا؟۔ آخر ہندو لازم بھی ایک نظام تھا، اس کی اپنی تہذیب بھی تھی۔۔۔۔۔ اس نظام اور تہذیب سے کٹ جانے کی آپ کو کیوں ضرورت پیش آئی تھی؟۔ آپ بھول رہے ہیں، اپنے اس مضمون میں آپ اسلامی دستور و نظام کو پاکستان کو ہندوستان سے الگ کرنے کی وجہ قرار دے چکے ہیں۔۔۔۔۔ آپ نے اس ڈیڑھ اینٹ کی مسجد کو الگ بنانا کیسے قرار دیا تھا؟۔۔۔۔۔ پھر

آپ کا وہ دو قومی نظریہ کیا ہوا؟ اگر دریا کی لہروں کی موافقت میں پیرنا ہی منزل مقصود پر
 پہنچنے کی ضمانت ہوتا ہے تو آپ اس کے خلاف کیوں سرے تھے؟ غالباً آپ کو
 علامہ اقبال کے اس شعر میں بھی کوئی معقولیت نظر نہ آئی ہوگی۔
 تندہی بادِ مخالف سے نہ گھبرا اے عقاب
 یہ تو چلتی ہے تجھے اونچا اڑانے کے لیے!

سرزمین عرب میں صدیوں قبل رونما ہونے والا وہ انقلاب بھی شاید آپ کو پسند
 نہ آیا ہو گا جس نے تاریخ عالم کے دھارے بدل دیے تھے، ظلم و بربریت کے طوفانوں کا
 منہ موڑ دیا تھا اور دھبی ترچھی، سسکتی اور دم توڑتی ہوئی انسانیت نے امن و عافیت
 کے گہواروں میں سکون کی سانس لی تھی۔ کیا آپ کو اپنی پوری تاریخ سے انکار ہے؟
 آپ نے دراصل سوچا ہی نہیں کہ اس ”ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ بنانے“ کے پس پردہ
 آپ کھینے کیا جا رہے ہیں۔ ہاں مگر جو شخص خالصتاً اسلامی نظام پر اصرار کو بے معنی
 سمجھتا ہے وہ قرآن مجید کے اس مرتبہ حکم کا انکار کیوں نہیں کر سکتا:
 ”لَا يَتَّخِذِ الْمُؤْمِنُونَ الْكَافِرِينَ أَوْلِيَاءَ مِنْ دُونِ الْمُؤْمِنِينَ“

(ال عمران ۶۸)

کہ ”مومنین کفار کو اپنا دوست نہ پکڑیں، ہاں یہ دوستی انھیں مومنوں
 ہی سے اختیار کرنی چاہیے۔“
 کیونکہ:

”وَمَنْ يَتَوَلَّكُمْ فَاِنَّهُ مِنْكُمْ“ (المائدہ: ۵۱)
 ”تم میں سے جو شخص ان (کفار) سے دوستی اختیار کرے گا تو وہ انہی
 میں سے ہو گا۔“

اور:

”مَنْ نَشَبَتهِ بَعُوْمٍ فَهُوَ مِنْهُمْ“
 ”جس شخص نے جس قوم کی مشابہت اختیار کی، وہ انہی میں سے ہوا کرتا ہے۔“

الغرض، مندرجہ بالا سیاسی تجاویز صرف نامعقول ہی نہیں، بلکہ ان کو تسلیم کرنے کا

مطلب یہ ہے کہ ہماری تمام تر توانائیاں دستوری کوششوں، سیاسی اتار چڑھاؤ اور جدید اداروں کی تشکیل و تنظیم پر صرف ہونی چاہئیں۔ اس لیے اصل بحث یہ ہے کہ مارشل لا کیسے ختم کیا جائے؟ صدارتی نظام کی بجائے پارلیمانی نظام حکومت کیسے لایا جائے؟ ۱۹۷۳ء کے دستور کے اندر صدر اور وزیر اعظم کے اختیارات کا توازن کیسے قائم کیا جائے؟ سیاسی پارٹیوں کی تعداد میں کمی کیسے کی جائے؟ اسمبلیوں میں صوبوں، عورتوں اور اقلیتوں کی نمائندگی کا کیا تناسب ہو؟ گویا ہمارے تمام مسائل بھی کچھ ہیں، جن سے عہدہ برآ ہو کر ہم زلنے کا ساتھ دے سکتے ہیں۔ حالانکہ ادارہ جات اور تنظیم و تنظیم کسی دستور و قانون کی تطبیق و ترویج کے لیے معرض وجود میں آتے ہیں۔ ان کا مقصد ایسی تدبیر ہو کہ ملک کا انسانی فکر اور دستور ظاہر و باہر طور پر پورے نظام زندگی میں سمودیا جائے، بلکہ مذکورہ بالا سیاسی تجاویز کو سب کچھ تسلیم کر لینے سے یہ لازم آتا ہے کہ اصل مسئلہ درخت لگانا اور اسے پروار، چڑھانا نہیں، بلکہ ٹہنیوں کی کانٹ چھانٹ اور انہیں ایک خاص سمت میں باندھ کر رکھنا ہے۔ بتائیے، شجر اسلام کیا ہم سے بھی مطالبہ کرتا ہے؟ — پاکستان کیا اسی لیے بنایا گیا تھا؟ — ”لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ“ کا یہی مفہوم ہے اور ”قرآن ہمارا دستور ہے“ کا یہی تقاضا ہے؟

ہم واضح لفظوں میں یہ بت چاہتے ہیں کہ مذکورہ طرز فکر نتیجہ ہے اس عہد و ہیمان سے انحراف کا جو تشکیل پاکستان کے وقت اندر ب العزت سے باندھا گیا تھا، دیکھئے، ان کے علاوہ بھی کبھی کسی آوازیں سننے میں آرہی ہیں؟

”کالعدم قومی محاذ آزادی کے سربراہ معراج محمد خان نے کہا ہے کہ اسلام سے بڑا سیکر لہ مذہب اور کوئی نہیں“

پھر اس کی وضاحت یوں فرمائی کہ:

”اور سیکر لہ کا مطلب لا دین نہیں ہوتا“ (روزنامہ جنگ، ۲ جولائی ۸۳ء)

یعنی اسلام کو گالیاں بھی دیتے ہیں اور ساتھ ہی یہ واضح کرنا بھی ضروری سمجھتے ہیں کہ اس گالی کا وہ مفہوم نہیں جو پوری دنیا جانتی اور سمجھتی ہے۔ گالی دینے کے اس الزام کے طریق کار کی دریافت کا سامنا کرنے کے لیے

مزید فرماتے ہیں،

”قائد اعظم نے کہا تھا، پاکستان ایسی ریاست نہیں ہوگی جہاں ملاؤں کی حکومت ہو!“ (حوالہ مذکور)

اسی طرح سرخوش لیڈر عبد الغفار خان کی یہ بات کہ،

”داڑھی سنت نہیں، بلکہ اسے ملاؤں نے رواج دیا ہے!“ دروز نامہ جنگ

حوالہ مذکور تحت عنوان ”غفار خاں اللہ تعالیٰ سے معافی مانگیں!“

در اصل یہ وہ لوگ ہیں جن کو صرف کرسی سے غرض ہے، یا سیاست جن کا مشغلہ

ہے۔ ڈاکے پڑیں، قتل و غارت ہو، قوم کی بہو بیٹیوں کی عزتیں پامال ہوں، شیطان

عین چور ہوں میں ننگا ناچے، ملک ہے یا نہ رہے، قرآن سے بغاوت ہوتی ہے تو

ہوتی رہے، اللہ رب العزت سے عبد و معبود کے رشتے کٹ جانا، یہ سب کچھ انہیں

منظور ہے، لیکن انتخابات سے دست بردار ہونا انہیں گوارا نہیں، تاکہ ایوان حکومت

ہمسایہ کی رسائی کی کوئی صورت ممکن ہو سکے، جبکہ ایک مسلمان کے نزدیک مذکورہ بالا

اصول اصل اہمیت رکھتے ہیں، جن کا حصول ملک میں شریعت کی عملداری سے ہی ممکن

ہے!۔۔۔ اور جس میں اگر تاخیر ہوئی تو یاد رکھیے، نہ صرف ان دشمنان اسلام کو،

جو پاکستان کی نظریاتی سرحدوں پر حملہ آور ہو کر اسے نیست و نابود کر دینا چاہتے اور

اس طرح قوم کی ہڈیوں پر اپنے عشرت کو بے تعبیر کرنا چاہتے ہیں، نہ صرف مزید مصلحت

کھینچنے کا موقع ملے گا بلکہ قبر خداوندی کا ڈھ کوڑا بھی حرکت میں آجائے گا جس کا مقصد

اور بالآخر تلخہ صرف یہ ہوتا ہے:

”وَمَا تَنْتَوْنَ إِلَّا تَشْتَبِدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ ثُمَّ لَا يَكُونُوا أَمْثَالَكُمُ“

کہ ”اگر تم باز نہ آئے، تو خدا نے تم پر ایسا قوم کا بدلہ لیا کہ تم سے علاوہ کسی دوسری قوم کو

اپنے فرامین کی بجا آوری کے لیے منتخب فرمائے گا۔۔۔“

طہ تمہاری داستان تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں!“

پس ۱۲ اگست کو یوم آزادی کے موقع پر اہم اعلان کی توقع کے پیش نظر ہم

”قرآن ہمارا دستور ہے“ کا نعروں کو اٹھانے والا اور اسلامی جماعتوں کو خصوصاً

جو اپنے مشور میں اور تو سب کچھ لقمی ہیں، لیکن اس لعروہ کو نظر انداز کرتی یا اس کی تاویل کرنا اپنا اولین فریضہ خیال کرتی ہیں، مشورہ دیتے ہیں کہ وہ اپنے قول و عمل میں طاعت پیدا کریں۔ اسی طرح ہم صدر مملکت اور چیف ملٹری لاء ایڈمرسٹریٹ جناب جنرل محمد ضیاء الحق سے یہ مطالبہ کرتے ہیں کہ کبھی مملکت کی فکری اساس و نقشہ، دستور ہوتا ہے اور ”لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ مُحَمَّدٌ رَّسُولُ اللَّهِ“ کی بنیادوں پر قائم ہونے والی اسلامی حکومت کا نقشہ قرآن مجید کی دستوری حیثیت کے اعلان و تعمیل سے ہی تشکیل پاتا ہے۔ لہذا وہ یوم آزادی کے موقع پر یہ اعلان فرمادیں کہ:

”آج سے ہم قرآن مجید کو اپنا دستور ماننے کا اعلان کرتے ہیں اور ہماری جتنی بھی انفرادی، اجتماعی، حکومتی کوششیں اور تدبیریں ہوں گی، وہ اسی شجر اسلام کے فروغ کے لیے ہوں گی!“ — اَصْلُهَا ثَابِتٌ وَ فَرْعُهَا فِي السَّمَاءِ“

والخرد عوانا ان الحمد لله رب العالمین!
(اکرام اللہ مساجد)

ہم اس تمام علماء کرام، ائمہ و خطباء مساجد کو، جن کا ”قرآن ہمارا دستور ہے“ پر ایمان ہے، یہ دعوت دیتے ہیں کہ وہ نہ صرف خطبات جمعہ میں اس موضوع کو زیر بحث لا کر عوام الناس کی اہمیت سے روشناس کرائیں بلکہ اجتماعی طور پر حکومت کی اہم شخصیات، بالخصوص صدر مملکت سے بذریعہ خطوط وغیرہ یہ مطالبہ کریں کہ وہ فلاح ملک و ملت و آخرت کی خاطر یوم آزادی کے موقع پر قرآن مجید کی دستوری حیثیت کا اعلان فرمائیں تاکہ یہ ملک پاکستان اپنی نظریاتی بنیادوں پر صحیح معنوں میں استوار ہو سکے۔

خدا تجھے کسی طوفان سے آشنا کر دے
کہ ترے بحر کی موجوں میں اضطراب نہیں!

(ادارہ)